ڈاکٹر انعام الحق کوثر

اسلام کی ضیا پاشیاں بلوچستان میں

ہمارا وطن عزیز پاکستان ایک زرخیز، سرسبز اور بہت سی خوبیاں رکھنے والا خطہ ہے۔ اس میں رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ مگر اس رنگا رنگی کے باوصف اس میں ایک بنیادی وحدت اور یگانگت کا دور دورہ ہے۔ اس بنیاد کو فراہم کرنے میں بلوچستان کو اولیت کا شرف ہے۔

تاریخ دانوں کے بموجب انسانی تہذیب تین آبی ادوار سے گزری ہے۔ پہلا دریائی دور، دوسرا بحیرائی اور تیسرا بحری دور۔

تہذیب کی ابتدا دریائی دور سے ہوتی ہے اور اس میں چھوٹے چھوٹے دریا یا نالے اوّلین تہذیب کے مراکز بنے۔ چنانچہ پاکستان کے جس حصّے میں سب سے پہلے تہذیب اُبھری وہ وادیٔ ژوب، وادیٔ شال، وادیٔ نال اور کولواہ کے علاقے تھے۔ یہیں سب سے پہلے دہقانی لوک معاشروں نے جنم لیا۔ بلوچستان کے انہی چھوٹے دریاؤں سے تہذیب نے اگلا قدم اُٹھایا تو وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

اس کے علاوہ پاکستانی آبادی کے اہم عناصر بھی کم و بیش بلوچستان سے ہی سندھ، پنجاب اور سرحد میں پھیلے۔ یہ اہم عناصر بلوچ، پشتون اور جاٹ وغیرہ ہیں جو اس وقت پاکستانی آبادی کے دو تہائی کے لگ بھگ ہیں۔

لیکن وحدت کا سب سے اہم رشتہ جو بلوچستان نے پاکستان کو مہیا کیا، وہ اسلام ہے۔ ہماری تاریخ سندھ کو باب الاسلام کے نام سے پکارتی ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اسلامی سیاست و ثقافت پہلی بار وسیع اور ہمہ گیر انداز میں سندھ میں ہی

جلوہ افروز ہوئی، مگر تاریخی حقائق پر پردے نہیں ڈالے جا سکتے۔ باب الاسلام ہونے کا شرف حقیقت میں بلوچستان کو ہی حاصل ہوا۔ تاریخ کے اوراق اس امر کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ ۲۳ ھ بمطابق ۶۴۳ء میں مکران ربیع بن زیاد کے ہاتھوں فتح ہوا، اور یہیں سے آگے بڑھ کر مسلمان ۴۴ ھ بمطابق ۶۶۴ء میں خضدار پر قابض ہوئے اور اُسے دارالحکومت بنایا۔ خضدار[1] (قزدار، قصدار) میں اسلامی حکومت کا قیام ایک نعمت سے فروتر نہ تھا۔ مسلمانوں نے یہاں کے مکینوں کی ثقافت اور معاشرت میں کسی قسم کا دخل دیے بغیر اپنے اعلیٰ اخلاق کی بدولت انھیں اتنا قریب کر لیا کہ مَن وتُو کا امتیاز مٹ گیا۔

سمعانی کی "کتاب الانساب" میں درج ہے کہ اصطخری کے زمانے میں قصدار میں مغیرہ بن احمد نامی ایک شخص حاکم تھا۔ جو عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا تھا۔ علمائے قصدار میں محمد جعفر بن الخطاب القصداری بڑے اُونچے پایہ کے عالم تھے۔ وہ نامور محدّث اور فقیہہ مانے جاتے تھے اور اپنے ہم عصروں میں زہد و تقویٰ کے اعتبار سے مثالی حیثیت کے مالک تھے۔ انھوں نے حدیث کا علم ابوالفضل عبدالصمد بن محمد بن نصیر العاصمیؒ سے حاصل کیا اور اُن کے تلامذہ میں سے ابوالفتوح عبدالغافر بن الحسین بن علی الکاشغری نے بہت زیادہ شہرت پائی۔

ابو داؤد سیبو یہ بن اسمٰعیلؒ پانچویں صدی کے نصف اوّل کے مشاہیر محدّثین میں سے ہیں۔ آپ قصدار سے نقل مکانی کر کے مکّہ معظمہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ جہاں آپ حدیث کا درس دینے میں مصروف رہے۔ ان کے اساتذہ کرام میں ابوالقاسم علی بن محمد بن عبداللہ بن یحییٰ طاہر حسینیؒ ابوالفتح رجاء بن عبدالواحد اصبہانی اور حافظ ابوالحسین بن ابی الحسن ردّاسی جیسے فضلا شامل ہیں۔ ابو داؤد نے ۴۶۰ ھ (بمطابق ۱۰۶۷ء) کے قریب وفات پائی۔

چوتھی صدی ہجری میں جب رود کی ایران میں مصروفِ تخلیق ہوا تو قندار میں اس

---

[1] بلوچستان کے شہر خضدار کو عربوں نے قصدار اور قزدار لکھا ہے۔ اس میں ایک صحابی بنام سیفان بن سلمہ الخذالی کا مزار ہے جو امیر معاویہ کے زمانہ میں میدقوم سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ معجم البلدان (ج ۴، ص ۸۶) میں قزدار آیا ہے۔

کی ہم عصر شاعرہ رابعہ بنت کعب القزداری نے فارسی شعر و ادب کے موتی بکھیرے۔ اس لحاظ سے موجودہ فارسی شاعری کو آگے بڑھانے میں قصدار نے بھی اپنا حق ادا کیا۔ مولانا جامی نے رابعہ کا ذکر ان مستورات میں کیا ہے جو معرفت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

پانچویں صدی ہجری (بمطابق گیارھویں صدی عیسوی) میں مشائخ ہنکار کی کیچ مکران میں تشریف آوری ہوئی۔ شیخ موسیٰ قریشی الہاشمی کے لختِ جگر سلطان ابوعلی نے خلقِ خدا کی بہبودی کی خاطر اُن کی حکمرانی قبول کی۔ اُن کے بعد اُن کے فرزند سلطان رشید الدین اور پھر اُن کے بیٹے سلطان قطب الدین تخت نشین ہوئے اور سلطان ابوالبقا تک یہ خاندانِ عالی مقام برسرِاقتدار رہا۔ سید السادات سید احمد توختہؒ (وصال ۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء مدفن لاہور) کیچ مکران (بلوچستان) تشریف لائے اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ اپنے قیام کے دوران اپنی بیٹی بی بی حاج (مدفن لاہور) کا نکاح ہنکار خاندان کے شہزادہ بہاؤالدین سے کر دیا۔ شہزادہ بہاؤالدین کے بعد اس کا بڑا لڑکا سلطان حمید الدین تخت نشین ہوا، مگر اُس نے تخت چھوڑ کر درویشی اختیار کی اور تلاشِ حق میں لاہور کا رُخ کیا اور سلطان التارکین کا لقب پایا۔ سید احمد توختہ جتنی مدت کیچ مکران میں رہے لوگوں کو روحانیت سے فیض یاب کرتے رہے۔

مشائخِ ہنکار نے ڈیڑھ سو سال تک حکومت کی۔ انھوں نے شریعتِ محمدیؐ کو عملی صورت میں پیش کرتے ہوئے عدل و انصاف اور جود و سخاوت میں نام پیدا کیا۔ شرع الانور کے مطابق مستورات کو وراثت میں اُن کے شرعی حقوق دیے گئے۔

سابق ریاست قلات میں میر احمد خان اوّل کے زمانے (۱۰۷۶ھ تا ۱۱۰۷ھ بمطابق ۱۶۶۵ء تا ۱۶۹۵ء) سے ریاست قلات کے دائرے میں اسلامی و شرعی قوانین اور اصولوں کا نظام کسی نہ کسی صورت میں جاری و ساری رہا۔ میر احمد خان دوم نے اپنے دورِ اقتدار (۱۱۲۷ھ تا ۱۱۲۹ھ بمطابق ۱۷۱۴ء تا ۱۷۱۶ء) میں ایک دیوانی کونسل کی تشکیل کے پہلو بہ پہلو محکمۂ قضا قائم کیا جو ہماری اب تک کی تحقیق کے بموجب پاکستان کے تاریخی پس منظر میں پہلی مثال ہے۔

میر نصیر خان نوری کے عہدِ حکومت (۱۱۶۴ھ تا ۱۲۰۹ھ/۱۷۵۰ء تا ۱۷۹۴ء) میں اسلام کے احکام سرکاری طور پر نافذ کیے گئے۔ اس کی اپنی زندگی شریعتِ محمدیؐ کے

مطابق تھی اور اُس کے یہاں بے پناہ مذہبی اُمنگ پائی جاتی تھی۔ اس کی والدہ محترمہ بی بی مریم صاحبہ بھی اسلام کی روح کی علم بردار تھیں۔ میر نصیر خانِ اعظم نے بذات خود تبلیغِ حق کے لیے بہت تگ و دو کی۔ جھالاوان میں ہر طرف توہمات کا چرچا تھا۔ شریعتِ محمدیؐ پر عمل نہ کیا جاتا تھا اور ہندویت غالب تھی۔ چنانچہ اُس نے ایک خاص وفد وہاں بھیجا جس نے میر موصوف کے فرمودہ مندرجہ ذیل احکام نافذ کیے۔

۱۔ شریعت کے اوامر و نواہی پر سختی سے عمل کیا جائے۔

۲۔ شادی، ختنہ اور دیگر تقریبات پر سرود، تمبور، نے، چنگ، دف وغیرہ مطلقاً استعمال نہ کیے جائیں۔

۳۔ شادیوں اور دیگر طربیہ مواقع پر مرد اور عورتیں اکٹھے چاپ (رقص) میں ہرگز حصہ نہ لیں۔

۴۔ بھنگ، چرس اور شراب ممنوع ہیں، اور کوئی عورت بے پردہ بازار نہ جائے۔

۵۔ غلاموں کی تجارت ممنوع ہے۔

۶۔ اموات پر مرد اور عورتیں زیادہ ماتم نہ کریں یعنی سر ننگے نہ کریں، بال نہ بکھیریں، چہرے مسخ نہ کریں اور اپنے آپ کو زخمی نہ کریں۔

۷۔ مسلمان فقیروں کے پاس ارادت مندی سے نہ بیٹھیں اور لمبے بال نہ رکھیں۔

۸۔ قصبات میں جمعہ کی نماز لازمی قرار دی گئی اور محلے کے لوگ محلے کی مسجد کے امام کی ضروریات کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔

۹۔ سیاہ کاری کے غلط الزام پر بہتان تراش کو اسّی دُرّے کی سزا ملے گی اور بعد میں وہ ساقط الاعتبار سمجھا جائے گا۔ بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ بلاجرم سختی اور بدسلوکی ممنوع قرار دی گئی۔

۱۰۔ ہندو اپنے مندروں میں مسلمان نوکر نہ رکھیں۔ مسلمان اُن کی پوجا میں شریک نہ ہوں۔ ہندوؤں کے مکان مسلمان باشندوں کے مکانوں سے اونچے نہ ہوں اور وہ شناخت کے لیے ماتھوں پر تلک یا ٹیکہ لگائیں۔ مندروں میں عبادات پر موسیقی ممنوع قرار دی گئی اور ماتم پر بھی۔ سیر و تفریح میں ہندو مسلمانوں سے آگے نہ نکلیں اور ایسے ہی

بازار گلی وغیرہ میں بھی ہندو زین والے گھوڑے پر نہ بیٹھیں۔

۱۱۔ مزاروں کے آس پاس بھیڑیں قربان نہ کی جائیں اور اُن کا خون بیٹوں، دُلھنوں، دولھوں یا گھوڑوں کو نہ لگایا جائے۔ لمبے لمبے بال رکھنے والے شیخوں کے سر تراش دیے جائیں اور بال کاٹ دیے جائیں اور اُنھیں مریضوں کے پاس نہ آنے دیا جائے، اور اُن پر مطلق اعتبار نہ کیا جائے۔ شادی بیاہ کے مواقع پر گھوڑوں وغیرہ کے ذبیحہ پر پابندی لگا دی گئی کیونکہ اُن کا گوشت شرعاً حرام ہے۔

۱۲۔ زکوٰۃ اور عُشر واجب کر دیے گئے۔

۱۳۔ سود ممنوع کر دیا گیا۔

۱۴۔ ملاؤں کے معاملات اور طرزِ عمل پر کڑی نگاہ رکھنے کی ہدایت جاری کر کے اُنھیں یا جماعت نماز پڑھانے کی تاکید کر دی گئی۔

میر نصیر خان نوری نے اپنے مذکورہ بیان کے آخر میں یہ قطعی حکم دیا کہ کسی بھی مرد کو شریعت کے دائرے سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ دی جائے، اور ان احکام پر عمل درآمد کرنے میں کسی قسم کا انحراف یا انکار نہ کیا جائے۔

میر نصیر خان اِعظم کا شرح انور کی روشنی میں اصلاحات کا یہ نفاذ ایک ایسا کارنامہ ہے جو سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے اور جس کی مثال ہم عصر تاریخ میں مفقود ہے۔ اُن کی مُہر پر یہ آیت کندہ تھی "حسبی اللہ ونعم الوکیل ونعم المولیٰ و نعم النصیر"۔

میر موصوف نے اپنے لشکر کے ہمراہ جو پشتون، بلوچ اور براہوئی سپاہیوں پر مشتمل تھا، احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مل کر جہاد میں بھرپور حصّہ لیا۔

میر نصیر خان نوری علم و ادب کا مُربّی تھا۔ قاضی نور محمد گنج آبوی اکثر میر موصوف کی خدمت میں موجود رہتے اور جہاد میں شرکت کرتے۔ انھوں نے جہاد کے چشم دید واقعات کو اپنے جنگ نامہ "تخصتر النصیر بلوچ" میں قلم بند کیا ہے۔

میر نصیر خان نوری کے بعد اُن کے جانشینوں نے ان کے احکام کا باقاعدہ تتبّع کیا اور اُن پر عمل کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہ احکام انگریزوں کی آمد تک کسی نہ کسی صورت میں نافذ رہے حتیٰ کہ محمود خان جیسے کمزور خان کے دورِ حکومت میں بھی دیوانی معاملات شرعی رائے

کے لیے قاضیوں کے سپرد کیے جاتے تھے اور اُس کے بعد ہی ممبرانِ جرگہ اپنی رائے دیتے تھے۔ انگریزوں کی مداخلت اور گرفت بھی میر نصیر خان نوری کی قائم کردہ شریعتِ محمدیؐ کی بنیادوں کو ہلا نہ سکی۔ اسی لیے تمام خوانین کے دور میں باقاعدہ قاضی مقرر تھے جو شریعتِ محمدیؐ کے نفاذ کے ذمہ دار تھے۔ اگرچہ انگریزوں کے زیرِ تسلط آنے کے بعد ریاست قلات میں پولیٹیکل ایجنٹ اور مکران میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ بغیر کسی قانونی جواز کے ایف سی آر ۱۹۰۱ء کے تحت عدالتی اختیارات بروئے کار لاتے تھے۔ پھر بھی جرگوں میں دیوانی نوعیت کے معاملات کے سلسلے میں قاضی کی رائے صائب متصوّر ہوتی تھی۔

۱۹۳۳ء میں میر احمد یار خان مرحوم نے تخت نشینی کے بعد میر نصیر خان نوری کی شریعتِ محمدیؐ کے نفاذ کی تحریک میں نئی روح پھونک دی۔ کیونکہ اس میں انگریزوں کے تسلط اور سرداروں کی انگریزوں کے اشارے پر بے راہ روی اور خلاف ورزیوں کے باعث کمی واقع ہوگئی تھی۔ میر احمد یار نے شریعتِ محمدیؐ کو زیادہ پُراثر بنانے کے لیے قاضیوں کو فیصلہ کرنے کے مکمل اختیارات سونپ دیے۔ وزیر معارف کا عہدہ قائم کر کے مذہبی اُمور کی نگرانی کا کام اس کے سپرد کر دیا اور رسم و رواج کے بندھنوں کو توڑ کر اپنے دائرۂ اختیار کے اندر مستورات کو شریعتِ محمدیؐ کے بموجب وراثت میں اُن کے شرعی حقوق دے دیے۔ جو بیشتر ازیں مکران کے علاوہ کسی دوسرے علاقے میں مروّج نہ تھے۔

شمالی بلوچستان میں اسلام دنیاوی اقتدار کے سہارے نہیں بلکہ اپنی صداقت اور روح پرور تعلیمات کی بدولت فروغ پذیر ہوا۔ پختونوں کی ایک تاریخی روایت کے مطابق ان کا جدِ اعلیٰ قیس (کیس)، عبدالرشید ہادیٔ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا تھا۔ اس قبیلے نے اسلام کو اس انداز سے اپنایا کہ پھر اسے کفر و ضلالت کا کوئی بھی حملہ مغلوب نہ کر سکا۔ چنانچہ اسلام پختون ثقافت کا ایک غیر فانی جزو بن کر رہ گیا۔ پختونوں نے نہ صرف یہ کہ جہاد کی خاطر ہزاروں سپاہی اور متعدد نامور جرنیل فراہم کیے۔ بلکہ تبلیغ اسلام کے لیے بہت سے علماء اور صوفیا بھی مہیا کیے۔ اُن میں پیر کبار سید شیخ عطا اللہ المعروف شیخ آتو (المتوفی ۵۵۰ھ/ ۱۱۵۵ء) شیخ بیٹ نیکہ یا بیٹ بابا، ملک یار غرشین، شیخ احمد ولد موسیٰ لقب احمد جوانمرد، شیخ اسمٰعیل سڑبنی، شیخ حسن افغان (وصال ۶۸۹ھ/ ۱۲۹۰ء) شیخ حتی المعروف قلات بابا (۶۲۳ھ/ ۱۲۲۶ء ـــــ ۶۶۸ھ/ ۱۲۶۹ء) اور اُن کے پوتے حضرت خواجہ

یحییٰ کبیر عرف غشتی (۷۰۷ھ/۱۳۰۷ء — ۸۳۴ھ — ۱۴۳۰ء) شیخ حسن المعروف شیخ کنڑ، میاں عبدالحکیم ناناصاحب (۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء — ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰ء) ۔ اُن کے مرشد میاں اللہ یار لاہوری تھے) اور اُن کے خلفا میاں نور محمد، ملا عثمان اخوند، میاں محمد حسن یٰسین زئی، مرید خاص باباخُرواری، ملا رحیم داد، ملا جان محمد کاکڑ، خواجہ میاں روح اللہ اخوندزادہ کانگزئی (۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء — ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) اور اُن کے نامور خلیفہ خواجہ فیض الحق جان چشتوی (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء — ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) اور اُن کا چشتوی بزرگان کا سلسلہ، علامہ عبدالعلی اخوندزادہ، آغا سیّد محمد یعقوب شاہ اور ملا عبدالسلام وغیرہ بہت زیادہ شہرت کے مالک ہیں۔

علاوہ ازیں انہی عظیم بزرگوں میں ایک اہم شخصیت بلوچستان کے شیخ علامہ محمد فاضل درخانی ریئسانی (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء — ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) تھے جنھوں نے میر نصیر خاں نوری کے عہد کے مُلا ملک داد کی روایت کو قائم اور دائم رکھتے ہوئے نہ صرف براہیویوں کے دلوں کو ایک بار پھر نورِ اسلام سے تابندہ کیا، بلکہ عالموں، فاضلوں مفسروں اور مبلّغوں کا ایک ایسا نامور گروہ پیدا کر دیا جس نے بلوچستان پر عیسائیت کی یلغار کو کسی طرح بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے دیا۔ اس گروہ میں علامہ محمد عمر دین پوری کا نام نامی سرِفہرست تھا۔

مولانا محمد فاضل درخانی تبلیغ کے لیے تنہا جاتے۔ کسی کے مہمان نہ ہوتے اور کسی کے گھر کا کھانا نہ کھاتے، تبلیغ کے دوران اس بات کو مناسب نہ سمجھتے، اپنے پاس ستّو اور گڑ رکھتے اور صبح و شام یہی کھا کر گزارہ کرتے۔ رات مسجد میں قیام کرتے اور زیادہ وقت رکوع و سجود میں گزارتے ——— یوں پوری بے لوثی سے انھوں نے گمراہ اور دین سے پھرے ہوئے لوگوں کو سیدھی راہ دکھائی۔ معاشرتی اصلاح پر بھی انھوں نے بھرپور توجہ کی۔ قدیم وضع کی شلوار کو سادہ شلوار میں تبدیل کرایا۔ فضول لباس کو ممنوع قرار دلا دیا۔

مولانا محمّد فاضل کی تبلیغی اور اصلاحی جدوجہد سے علاقے کے لوگوں کے فکر و نظر اور سیرت و کردار میں جو تبدیلی آئی، اُس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جہاں رات دن ڈاکے پڑتے تھے اور قتل و غارت کرنا بہادری کا کام سمجھا جاتا تھا وہاں ایسا امن قائم ہوا کہ اُس کی مثال کم ملتی ہے۔ وہ کام جو بڑے بڑے جابر حاکم نہ کر سکے ایک فقیر سیرت

درویش نے اسلام کی اخلاقی تعلیم سے مزین ہو کر قلیل عرصے میں کر دکھایا۔

مولانا کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ ایک ہی صاحبزادی تھی، جس کی شادی عالم اور متقی حاجی محمد عظیم ریٹسانی سے ہوئی۔ اُن کے فرزند ارجمند مولانا عبداللہ درخانی (۱۲۹۸ھ/۱۸۷۸ء ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) تھے، جو مولانا محمد فاضل کی صحبت و تربیت میں کُندن بنے۔ آپ کی وفات پر مولانا عبداللہ ہی ان کے جانشین ہوئے اور ادارۂ مطبوعات، مسجد اور لنگر وغیرہ کا انتظام سنبھالا۔ آپ نے ڈھاڈر میں دینی مدرسہ بھی قائم کیا۔

گرمیوں میں آپ سریاب (کوئٹہ) تشریف لاتے۔ وہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ منقطع نہ ہوتا۔ آپ فتویٰ نویسی بھی کرتے تھے۔ اپنے علمی تجربے کے باعث ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء سے ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء تک سابقہ ریاست قلات کے قاضی القضاۃ رہے۔ حضرت قطب عصر خواجہ محمد عمر چیشتوی (۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء — ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ آپ ایک خوش گو شاعر بھی تھے۔ متعدد کتب کے مصنف تھے۔

مولانا فاضل کے ایک قابلِ احترام شاگرد مولانا بنوجان (المتوفی ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء) تھے جو مستونگ کے قریب چوتو کے قمبرانی یا قمبراڑی قبیلے کے فرد تھے۔ آپ ایک جیّد عالم اور جلیل القدر مصنّف تھے۔ بلوچستان کے جن مذہبی رہنماؤں نے عیسائی مبلغین کی کوششوں کو بُری طرح ناکام بنایا اُن میں آپ کی حیثیت ممتاز ہے۔

ایک طرف انگریز تھے جن کے پاس سرمائے کی فراوانی تھی وہ اپنے پمفلٹوں کی تعدادِ اشاعت میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے تھے۔ دوسری جانب مولانا اپنی کم مایگی کے باعث اپنی تصانیف کی تعدادِ اشاعت نہ بڑھا سکے۔ خود بھوکے رہے، لیکن اپنا اثاثہ مذہبی کتابوں کی اشاعت پر لگا دیا۔ نتیجتہً لوگ رات کو آگ کے قریب بیٹھ کر مولانا کے مذہبی اشعار ترنّم سے پڑھتے اور دوسرے اُنھیں بڑی لگن کے ساتھ سنتے۔ یوں مولانا کی کتابیں کم چھپیں، لیکن اُن سے نسبتاً زیادہ لوگ بہرہ یاب ہو سکے۔

مولانا عبدالمجید چوتوی مولانا بنوجان کے فرزندِ ارجمند تھے۔ جنھوں نے مولانا محمد فاضل اور اپنے والدِ محترم سے بیک وقت علمی، دینی اور باطنی استفادہ کیا۔ آپ کی دو کتابوں (مفرح القلوب، گلشن راغبین) میں مناجات، مولود شریف اور غزلیات کے علاوہ دینی مسائل کو سلیس، عام فہم اور پُرخلوص لب و لہجے میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے قبیح رسوم اور

مجالسِ عیش وطرب کے خلاف کھل کر لکھا۔ آپ نے نیم ملاّ کی کمزوریوں کو بھی بیان کرتے ہوئے کہا:

"اے نیم مُلاّ! میں تمھارے چہرے پر بھی جہاد کے آثار نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اگر تم مردِ میدان ہو تو سب سے پہلے اپنے نفس کے خلاف جہاد کر کے اسے مار ڈالو۔"

آپ کی ایک اور کتاب "جوشِ حبیبؐ" کے اشعار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری عقیدت کے آئینہ دار ہیں۔

مولانا محمدؐ فاضل دُرخانی کے ایک اور مایۂ ناز شاگرد اور چچا زاد بھائی مولانا عبدالحیٔ تھے۔ انھوں نے تبلیغ وارشاد کے علاوہ سلسلۂ مطبوعات بھی جاری رکھا۔ اُن کے عظیم ترین شاگرد مولانا محمدؐ عمر دین پوری (المتوفی ۱۹۳۸ء) تھے۔ وہ مستونگ شہر کے قبیلہ بندرانی میں پیدا ہوئے اور مدرسۂ دُرخان سے فیض حاصل کیا۔ وہ بیک وقت، مصنف، مُبلّغ، مترجم، مُفسّر مولف اور فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عملی سیاسی کارکن بھی تھے جو مولانا عبیداللہ سندھی سے رابطہ قائم کر کے افغانستان کی طرف ہجرت کرنے والوں کی تحریک میں شامل ہوئے تھے نظم ونثر دونوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے اڑتالیس کتابیں براہوئی زبان میں تصنیف وتالیف کیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کا براہوئی زبان میں ترجمہ ہے۔ اس وقت یورپی مشنری بلوچستان میں پوری جانفشانی سے تبلیغ میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۷ء میں انجیل کا براہوئی ترجمہ شائع کر دیا تھا۔ مولانا محمد عمر دین پوری کا ترجمۂ قرآن حکیم ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۵ء میں چھپ کر براہویوں کے لیے ڈھال کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مولانا حضور بخش جتوئی نے قرآن کریم کا ترجمہ صاف وشستہ بلوچی زبان میں کیا۔

نتیجۃً انگریزوں کی لگاتار اور سر توڑ تبلیغی کوششوں اور دنیاوی فوائد کی جگمگاہٹ کے باوجود ایک بھی براہوئی یا بلوچ یا پٹھان دینِ اسلام سے منحرف نہ ہوا اور اسلام اپنی صداقت اور روحِ پرور تعلیمات کے بل بوتے پر فروغ پذیر رہا۔

حضرت سلطان باہوؒ (۱۰۳۸ھ/ ۱۶۲۸ء ـــــ ۱۱۰۲ھ/ ۱۶۹۰ء) کے خاندان کے بزرگان وخلفا کا بلوچستان میں دورِ حاضر تک ایک مسلسل سلسلہ چلا آ رہا ہے، یہ لوگ لگن اور محنت کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو عام کر رہے ہیں۔ کٹبار شریف والوں کا سلسلہ بھی حضرت

سلطان باہوؒ سے ملتا ہے، وہ بھی تین صدیوں سے اسلام کی تبلیغ میں مگن ہیں۔
بلوچستان کے طویل و عرض میں دینی مدارس دینِ مصطفوی کی اشاعت میں شب و روز مصروف ہیں۔ سارے بلوچستان میں ایسی پاک محفلیں منعقد ہوتی رہی ہیں اور ہوتی ہیں۔ جن میں ہادیٔ برحق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ مبارک بے پناہ عقیدت اور احترام سے کیا جاتا ہے۔ بقول ناشط صدیقی ؎

ذرّہ حبِ نبیؐ ناشط ہے جس کے قلب میں
جنت الفردوس میں وہ شخص داخل ہو گیا

بلوچستان میں اسلام کی ضیا پاشیوں کے باعث مردانِ کوہستانی اور بندگانِ صحرائی لذتِ آشنائی سے اتنے آگاہ ہوئے کہ وہ دوعالم سے بیگانہ ہو کر صرف اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے ہو کر رہ گئے بقول اقبال ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی